گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ
کاغذ اور کینوس

Aneel Academy

BOOK PRODUCERS & DISTRIBUTORS
P B No 56
3408 - Tranby NORWAY

ناشر : انیل اکیڈمی

بُک پروڈیوسرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

پوسٹ بکس نمبر ۵۶ ۸۴۸۳ تھرامبی، ناروے

فون : ۴، ۸۵/۲۰/۴ (۰۳)

بار اوّل ــــــــ ایک ہزار

سال اشاعت ــــــــ ۱۹۸۵ء

قیمت ــــــــ ۴۰ روپے

مطبع ــــــــ (پریس کا نام)

کتابت ــــــــ محمدؐ انور، لاہور

Scanned by CamScanner

Amrita Pritam

پیارے مسعود!

بلغاریہ دا اک بہت پیارا شاعر ہے — لیوبومیر لیوچیو!
اوہ نے اپنے ملک دے حالات نوں ساہمنے رکھ کے
لوڑوں اک نظم لکھی سی "اوہ میری زمین قتل ہوئے شعراں
دی زمین ہے" —
تے ہن جدوں تہاڈے حالات نے اوہ نوں ایہہ لفظاں دے نویں
دل نے... ہے کہنا چاہندی ہاں "اوہ ساڈی زمین
قتل ہوئی شاعری دی زمین ہے" —
تے اج جیویں تساں اپنی نظم اُٹھائی ہے —
میں ایہناں نظماں نوں اردو وچ ترجمہ کرن لگی۔
میں کس طراں تہاڈا شکریہ ادا کراں!
اوہ نظماں تسیں جیویں چاہو شائع کر لوو۔

Amrita
12/3/85

۱— امرتا پریتم

۲— کہوں آج میں وارث شاہ سے

۳— ایمبرائیڈری

۴— آتش پہیلی

۵— صدا

۶— ابٹن

۷— ایک بات

۸— پھر تجھے یاد کیا

۹— روشنی کے چھینٹے

۱۰— سُرما

۱۱— لُقمہ

۱۲— شمع

۱۳— مُقدّر

۱۴— دعوت

۱۵— ہچکی

امرتا پریتم

ہاتے اِک درد،
کہ سگرٹ کی طرح
کیسے چُپ چاپ پیا ہے میں نے

صرف کچھ نظمیں
کہ سگرٹ کی بجھی راکھ کے مانند
جنم دیں میں نے

کہوں آج میں وارث شاہ سے

کہوں آج میں وارث شاہ سے، کہیں قبرِ لحد سے بول
اور آج کتابِ عشق کا، کوئی اگلا باب ہی کھول

روئی اک بیٹی پنجاب کی، تو نے لکھے کتنے سوز
اور آج ہیں لاکھوں اشک فشاں، کہیں وارث تجھ سے روز

اُٹھ دردوندوں کے دردمند! اُٹھ دیکھ اپنا پنجاب
بچھی جنگل جنگل میتیں اور خون سے بھری چناب

ان پنج ندیوں کے سیل میں دیا زہر کسی نے گھول
بند اس زہریلے آب کا، دیا ارض کی جانب کھول

اس سونا جنتی خاک کے، ہر روئیں میں پھیلا زہر
بالشت برابر سُرخیاں اور پھوٹ بہے جیوں قہر

اور جنگل جنگل گھومتی یہ زہر میں بجھی ہوا!
اور بانسریوں پر بانس کی، دیا ناگ کا رُوپ چڑھا

ناگوں کے ڈنک ہی ڈنک تھے، چہروں نے بدلے رنگ
ہر آن میرے پنجاب کے، نیلے پڑ گئے انگ

گلے میں ٹوٹی نغمگی، نکلے پر ٹوٹے تار ——
چرخے پر چُپ سی چھا گئی، بچھڑی سکھیوں کی ڈار

لُڈّن نے سیج اور کشتیاں، دیں طُوفانوں میں بہا
شاخیں جھُولوں کے سنگھی، پیپل نے دی ہیں اُڑا

جو چھڑنی پیار کی سانس سے، وہ بانسریا ہوئی گُم
رانجھے کے سارے ہم جولی، گئے بھول اُس کا سرگم

قبریں لگیں ٹپکنے، برسا دھرتی پر خُون
پریت بھری شہنائیاں، گئیں بن روضوں کا شگون

کبھ دو آج یہ بن گئے، سب حُسن و عشق کے چور
کہاں سے ڈھونڈ کے لائیے، وارث شاہ ایک اور

ایمبرائیڈری

روشنیاں گُل بار، سلائی کون کرے
تابدان سُپہری، سُورج سلگاؤں
من کی اُونچی بام، چراغاں کون کرے

کاہکشاں کی ندیا سے گاگر بھر لیتی
درد کا گہرا دریا، پانی کون پیئے

گرہستی کی آگ سونپ کر چلی ہو تم
دل کی جلتی شال، شرارہ کون سہے

اپنی سمت سے ساری بات تمام ہوئی
لیکن اِک اِک ہُوک تمہارا ذکر کرے

روشنیاں گُل بار!

آتش پہیلی

اِک پہیلی آگ کی، تم نے سنائی تھی کبھی
رُوح کی سگرٹ تھی اک، تم نے جلائی تھی کبھی
اِک شرارے کی عطا سے دِل دھواں دیتا رہا
وقت اپنی کلک سے تحریر اِک لکھتا رہا

صرف چودہ منٹ کا کھانہ بھی ہے دیکھ لو
پُورے چودہ سال بیتے ہیں قلم نے کہہ دیا

جسم تھا میرا مگر سانسیں تری چلتی رہیں
یہ زمینوں کی گواہی تھی دُھواں اُٹھتا رہا

رُوح کی سگرٹ جلی تو مہک میرے عشق کی
کچھ تو سانسوں میں جلی اور کچھ ہوا میں مل گئی

صدا

پھیر کر عُمروں کی اِک لمبی مسافت تیری آواز آتی
سبزہ بستی کے پاؤں پہ جیسے کوئی مرہم مل دے
جیسے شانوں کی بلندی سے گزر جاتے ہُما
گیسوئے شب سے پھُٹے جیسے قمر پھُول کوئی
نیند کے ہونٹوں سے خوابوں کی مہک جیسے اُڑے
رات کے ماتھے کو آداب کہے پہلی کِرن

یُوں ہر اِک حرف سے اُڑتی رہی تیری خُوشبو
ہجر کی ہچکی میں بھی سُنتے رہے شہنائی
پھیر کر عمروں کی اِک لمبی مسافت تیری آواز آتی
سسکتے ہونٹوں سے پھر بہنے لگی گیت کی سطر

اٹیرن

آج توڑا ہے قلم نے اِک غزل کا قافیہ
عشق میرا کون سے منصب پہ فائز ہوگیا
دیکھ تجسیم بصارت ! بیٹھتی ہوں نُور میں
ہجر کی اِس پھانس کو آ کر ہتھیلی سے نکال
جس اندھیرے کے سوا کاتا نہیں ہے اور کچھ
وہ محبّت دے گئی کرنیں مجھے لپٹی ہوئی
اُٹھ ذرا اپنے گھڑے سے اِک کٹورا آب دے
بیٹھ کر میں دھو تو لوں ان راستوں کے حادثے

ایک بات

عشق میرا ہے بشیرِ مصطفیٰ اور سالوں کے سیمیں چاول
مانجھی دھوتی دِل کی ہنڈیا
دنیا جیسے گیلی لکڑی، گھر آتے ہیں دُود کے بادل
رات کوئی پیتل کی کٹوری،
قسمِ قلعی سب اُتر گئی ہے۔
چاہت آج ضعیف ہوئی ہے
خواب مرا سرطان زدہ سا، نیند مری تلخی سے بوجھل
بنتِ بدن کے جل تھل اعضا، تنگ ہے یادوں کی انگوٹھی
اُنگلیوں میں داغ اُجاگر
عصر کے زرگر کی مملوکہ رہتی اُس سے بچھڑ گئی ہے
یخ بستہ ہے عشق کا پیکر، کیسے سیئوں میں گیت کا کُرتا
خیال سلائی اُدھڑ گئی ہے
نوک قلم کی ٹوٹ گئی ہے
بات میری اِک بکھر گئی ہے

پھر تجھے یاد کیا

پھر تجھے یاد کیا، آگ کو چُوما ہم نے
ساغرِ عشق ہے لبریز، سمِ قاتل سے
ہم نے مانگا ہے پھر اِک گھونٹ اسی ساغر سے
گھول کر مہر دیا دھرتی کو غوطہ ہم نے
بارہا آفاق کو پوتا ہے صفِ انجم سے
پیار کرنا تھا ہمیں قلب کا دریا اُس دن
ظُلم کے عہد کے لہنگے کو سنبھالا ہم نے
رات بھر خوابوں کی کلیاں سی چٹکتی ہی رہیں
عشق کی دھنکی پہ اُس عمر کو ہم دُھنتے رہے

روشنی کے چھینٹے

نور کا تال تھا اِک
بہنگیاں لے کے چلے تارے خموں کو بھر بھر
رُوح پر چھینٹے پڑے
جان سے مہنگی کئی باتیں سرِ ذہن ہوتی ہیں تازہ
یہ زمیں خار سے پُر، چرخ کا آنچل اُلجھا
اور اِک شاخِ شکستہ میں پھنسا

بُوجھ اے جان مری!
جاتے جاتے یہ لبِ شب نے بُجھارت کر دی
دل کی پوریں تھیں بہت نازک سی
سوزنِ نُور بجُھی آر سے اُس پار ہوئی
اور یادوں کا الاؤ بھڑکا
لاکھ آنچل کو بچایا پہ کِنارا نہ بچا

سرما

کانپتی ہے جان میری، ہونٹ نیلے ہو گئے
رُوح کے پیروں سے اُٹھی کپکپی اور چھا گئی
عمر کے آکاش پر سالوں کے بادل رعد میں
آنگنوں میں ناچتے، قانون، گولے برف کے
پھاند کر گلیوں کی کیچڑ، تم اگر آؤ کہیں!
میں تمہارے پاؤں دھو ڈوں

خاور یں قامت تمہاری
میں اُلٹ کر ایک گوشہ اوڑھنی کا
توڑ لوں گی استخواں کا برف بستہ زمہریر
اِک کٹورا دھوپ کا، پی لوں گی اِک ہی سانس میں
ایک ٹکڑا دھوپ کا اپنے بطن میں ڈال لوں گی
اس طرح شاید گزر جاتے یہ سرماتے حیات

لُقمہ

پچھلی رات کو بنتِ جان نے خواب کا لُقمہ توڑا
جانے کیسے خبر یہ اُڑ کر گوشِ سما تک پہنچی
شاہ پروں نے سُنی خبر اور لمبی چونچوں نے بھی
کُندذہن نے سُنی خبر اور تیکھے ناخنوں نے بھی
اِک لقمے کا ننگا جسم اور راز کُھلا خوشبُو کا
نہ کہیں من کی اوٹ ملی، نہ تن کا لپٹین اوڑھن
اِک جھپٹے میں چھن گیا لُقمہ، ہاتھ بھی چھل گئے دونوں
اِک جھپٹے میں گال ادھڑ گیا، رُخ پہ خراشیں آئیں
مُنہ میں لُقمہ رہا نہ باقی، رہ گئیں اُس کی باتیں
اُڑیں اُفق پہ راتیں ایسے، جیسے کالی چیلیں!

شمع

میں اِک شمع کلیسا ہُوں
جو ہر لوم اپنے سینے کے الاؤ کو
فروزاں کر کے پاؤں میں
نکل جاتی ہُوں گرجے سے
گزر کر جلتی بجھتی انگھڑیوں کے اندروں پیہم
پہنچ جاتی ہُوں حُسنِ لفظ تک میں
یہ حُسنِ لفظ کاغذ کی امانت ہے
کسی کاغذ سے جب باہر نکلتا ہے
زمیں کا جسم چھوتا ہے
زمیں کے خون میں لت پت سا ہو کر بھیگ جاتا ہے
مسیحِ عصر میرے! تو نہیں ملتا تو میں کچھ ٹمٹمائی سی
تفنگوں گولیوں کی گھن گرج سُنتی ہوئی
اُس کلیسا کی طرف واپس چلی جاتی ہُوں
جو اب تک کسی بھی ملک کے اندر
حیطۂ تعمیر میں آیا نہیں

مقدّر

گرفتِ شب کس قدر درخشاں
یہ راتیں لائیں پکڑ کے جگنو کوئی قمر کا
تو نیند نے اِک شجر لگایا
وہ کون تھا چوب کار، گھڑ لائیں انگلیاں جسکی خواب سنتر
تیری نگاہوں نے ہاتھ اپنا بڑھا دیا ہے
کہ اک ملاقات ہیں وہ باتیں پھلانگ آئیں حیات زینہ
ہمیں مبارک ہو درس اپنا
کہ پنجگانہ صلوٰۃ بستہ اُٹھائے مسجد میں آ گئی ہے
نظر کے آگے پڑے ہوئے ہیں جو وید مصحف
یہ کون سی شاخسارِ دل سے گری ہوئی پتیاں ہیں بولو
وہ کون زرگر تھا جس نے انگشتری بنائی
کہ ایک دن قسمتوں نے جا کر جڑا تھا اِک درد کا نگینہ
یہ اوکھلی ہے فراق والی
کہ دیکھ اپنی حیات آئی ہے چھڑکے اُلفت کے چاولوں کو
صلیب اِک گاڑی ہے دُنیا کے صاحبوں نے
جہاں کھڑی ہو کے عشق رُوحیں نوشتہ زیست پڑھ چکی ہیں

دعوت

دعوتِ دخترِ شب ______

چھڑ پکے ناروں کے چاول تو چڑھاتی دیگیں

کون لایا ہے یہ مینا تے قمر!

مے کا اِک گھونٹ ہے یہ نُور، سما چشمِ خُمار

مُختلج قلبِ زمیں آج ہوا، میں نے سُنا

شاخساروں کے یہاں پھول ہوتے ہیں مہماں

اس سے آگے ہے مقدّر کا نوشتہ کیا کیا

کون تقدیر کے گھر پوچھنے جائے گا بھلا

جب کبھی عمر کے اس کاغذ پر

ثبت کرتا ہے ترا عشق انگوٹھے کا نشان

کون دے سکتا ہے اُن قیمتی لمحوں کا حساب

نخل اسطور کی چھاؤں کے تلے کام دہن کو کس نے

آکے بُھسلایا ہے اور شیر سے گا گر بھر لی

کون سُنتا ہے ہوا کی سسکی ______

چل مری جان چلیں کاتب تقدیر کے ساتھ

ہچکی

ہل رہے ہیں ہونٹ کیوں آکاش کے
پاس ہو کر سُن ذرا سطحِ زمین
یہ کسی عیسیٰ کے وہ کلمات ہیں
جو کبھی سولی پہ تھے اُس نے کہے
کس نے سُلگائی ہے بھٹی رات کی
کھولتی ہے دیگ خوں کی کس طرح
اہلِ دنیا! داستاں دُنیا کی ہے
دیگ میں پھر بیٹھنا ہے عشق کو
ذکر تھا دشتِ بلا کے قہر کا
رُک گیا سانسوں کا چلنا قافلہ
لکھ رہا ہے کون میرا مرثیہ
ٹوٹنے کو ہے ستارہ چرخ پر
پھر کسی نے پونچھ کر دستِ حنا
کھول ڈالا ہے، کلیرا، بانہہ سے

کون عاشق پھر سے دانا باڈ کا
چل دیا تیروں کو ہچکی سونپ کر
سامنے اشجار کی قبریں کٹی
نعشِ گُل کو بڑھ کے دو کندھا ذرا
جس طرح ڈھانپا قلم نے عشق کو
اُس کفن کا خوب چرچا ہو ذرا

میرا پتہ

تو میں نے آج اپنے گھر کا نمبر مٹا دیا ہے
گلی کے ماتھے پہ اُس کا عنوان جو لکھا تھا، مٹا دیا ہے
ہر ایک رستے کی سمت کا نام پونچھ ڈالا ہے
مگر،

جو تم مجھ کو ملنا چاہو بہ ہر تقاضہ
تو ہر ریاست کے ہر نگر کے ہر ایک کوچے کے در پہ دستک ضرور دینا
یہ بد دعا ہے، یہ اک بشارت بھی ہے
مگر تم،
جہاں بھی آزاد روح کی اک جھلک نظر آئے، یوں سمجھنا
کہ میرا گھر ہے۔

ایک مکتوب

چاند اور سورج دو دواتیں قلم نے ڈبکی لگائی
"لکھ تم تمام دھرتی، پڑھ تم تمام لوگ"
حکمرانو، دوستو!
گولیاں، بندوقیں اور ایٹم بم چلانے سے پہلے، پڑھنا یہ مکتوب
ستاروں کے حروف، کرنوں کی بولی، جو پڑھنا نہ جانو
کسی عاشق ادیب سے پڑھوا لو، اپنی کسی محبوبہ سے پڑھوا لو
اور ہر ایک ماں کی یہی مادری زبان ہے
آج بیٹھ جاؤ کسی بھی جگہ پر اور خط پڑھوا لو کسی بھی ماں سے
چاند اور سورج دو دواتیں، قلم کو ڈبکی لگاؤ، خط کی رسید بھجواؤ
اور دنیا کی خیر و عافیت پر بھی دو حرف لکھنا
تمہارے مکتوب کی منتظر ـــــ تمہاری اپنی زمیں

میناۓ شوق

عشق پُرساں ہے اے زندگی ! تو نے دن کس طرح سے گزارے
زندگی نے کہا، "میں نے سپنے نہارے"، حِنا سے نکھارے
عشق پُرساں ہے اے زندگی ! آنکھ کیسے بُنے اشک پارے
زندگی نے کہا " تیری زلفوں میں، میں نے سجاتے ہیں لاکھوں ستارے
عشق پُرساں ہے اے زندگی ! کس طرح روشنی جگمگائی
زندگی نے کہا، " میں نے آتش تری حسن کی اک ٹوکری میں چھپائی
عشق پُرساں ہے اے زندگی، کس طرح سال تو نے بتائے
زندگی نے کہا، " میں نے تیری محبت کو دردوں کے ملبوس ہی پہنوائے
عشق پُرساں ہے اے زندگی، " زخم کی لذّتیں کتنی کاری لگی ہیں
زندگی نے کہا۔ " میں نے خونِ جگر سے نگونوں کی شالیں رنگی ہیں
عشق پُرساں ہے اے زندگی، " تو نے اعمال کی داستانیں یہ کیسے لکھی ہیں
زندگی نے کہا، " شوق مینا سے رنج و الم کی سشدا ہیں چکھی ہیں
عشق پُرساں ہے اے زندگی، " عمر کس طور سے وار کر دی گئی؟
زندگی نے کہا، " میں ترے نام پر جان اپنی لوا کے قربان کر دی گئی.
عشق پُرساں ہے اے زندگی تو بتا ! عاشقِ زار کا کیا ٹھکانہ
زندگی نے کہا، " یار کے گھر کی چوکھٹ کے پتھر بھلے، پر نہ کھیڑوں کے آنگن میں جانا

میری شبِ بیدار

رات بیدار مری ، عکس ترا خوا بیدہ
ایستادہ شجرِ مہر سے توڑی ہیں کسی نے کرنیں
چاند کا گوٹا اُدھیڑا ہے کسی نے امشب
کس کی نیندوں کو یہ رویا کا بُلاوا آیا
عشق کا زخم مرا ، سی دیا یادوں نے تری
توڑ کر ٹانکے ، یہ لوٹا دیتے دھاگے ہم نے
جُرمِ عشق مرا آج ہے پُر درد بہت
انتظاروں میں سے اِک قطعہ تراشا ہم نے
ہوک دھرتی سے اُٹھی، چرخ نے اِک سسکی بھری
تپتے دشتوں میں سے اک قافلۂ گل گزرا
پی لی بارود نے گندم کی مہک آج کے دن
امن کا ایک ہی ایمان تھا سو بکنے لگا
دنیوی روشنیوں کو صدیاں اُلاہنے دیں گی
موسمِ عشق میں نفرت کو یہ لویا کس نے؟
خُون انسان کا انسان سے محوِ سوال۔
کیسے چُومے رسن ودار نے ہونٹ عیسٰی کے

کیسی شب تھی کہ وہ جب گزری ہے افتاں خیزاں
چاند کا پھول بھی پاؤں کے تلے مسلا گیا
ہنہنایا فرسِ خور تو وہ خور جبیں گھری
رو دیا عمروں کی اس لمبی مسافت کا مسافر راضی
رات کیوں سہم گئی، ظلمتِ شب کیوں کانپی
کوئی جگنو سا یقیں بن کے کہیں پر چمکا
چشمِ شب پھڑکی ہے شاید ہے کوئی نیک شگون
اونچی دیوارِ سما پر کوئی خاشاک ضیا چمکا ہے
کیا کرے شاخ کہ پھولوں کی ہے ممتا قاہر
آج انسان سے انساں کا مقدر بولا
موڑ کر لا دو یقیں کا وہ مسافر ---———
جو جہاں پر بھی ملے

یاد

آج سُورج نے ذرا گھبرا کر، نُور کا ایک دریچہ کھولا
روزنِ ابر کیا بند اُس نے، زینۂ تار سے نیچے اُترا
ابروتے چرخ سے جانے کیوں کر، عرق بہنے لگا قطرہ قطرہ
کھول کر تاروں کے سارے تکمے، چاند کا کرتا اُتارا اُس نے
گوشۂ دِل میں تھی میں آج، کہ جب یاد تری آئی تھی
جیسے نم چوب سے اخراج کرے، گاڑھا اور کڑوا دھواں
سینکڑوں سوچوں کی آمد آمد ——————————
خشک لکڑی کے بدن سے جیسے، ہوک اُٹھے شعلۂ عنّابی کی
لکڑیاں دونوں ابھی گُل کر دیں ——————————
سال ایسے ہیں کہ بکھرے ہوئے انگر جیسے ——————————
ان بُجھے اور بُجھے
وقت کا ہاتھ لگا جب چُھنے، پوروں پر آبلے لو دینے لگے
دستِ اُلفت سے چُھٹی اور گری، رُوح کی ہنڈیا بھی یوں ٹوٹ گئی
آج تاریخ بھی دسترخواں سے، گرسنہ لوٹ گئی

کُفر

تو آج ہم نے فروخت کر دی ہے ایک دُنیا
اور ایک مذہب مزید لاتے ہیں
کُفر سرزد ہُوا ہے ہم سے
یہ تھان بنوا لیا ہے خوابوں کا
ایک گز کاٹ کر یہ کپڑا ___
سیا ہے اِک جُبہ زندگی کا ___
تو آسماں کے گھڑے سے امشب ___
پیا ہے اِک گھونٹ چاندنی کا ___
چکائیں گے سب حساب اُن کا ___
جو گھڑیاں مانگی تھیں قرض کے طور پر اجل سے ___

حادثہ

آج تھیں جتنی بیاضیں شیلف پر
اخبار تھے جتنے سبھی ——————

آج وہ اِک دوسرے کے خستہ کاغذ پھاڑ کر
شیرازہ بندی توڑ کر کچھ اس طرح اُلجھے باہم
کا پنج میری سوچ کے کٹ کر شگفتہ ہو گئے
ان گنت ملکوں کے نقشے اور ساری سرحدیں
اِک دوسرے کو بازوؤں اور پنڈلیوں سے کھینچ کر ٹھنگا گئے
اور اِس دُنیا کے سارے اِزم سارے فلسفے
سب کے سب اک دوسرے کا ٹینٹوا دابے رہے
رن پڑا گھمسان کا اور خون اُچھلا بے حساب
لیکن اِک حیران کُن سا حادثہ برپا ہُوا
کچھ کتابیں، روزنامے، اِزم اور نقشے مگر ایسے بھی تھے
جن کے جسموں سے لہو کی جا
سِم اسود بہا ——————— بہتا رہا

تقریر

لفظ جب سوچوں سے طلاق لیتے ہیں
تو بازار میں ایک الاؤ پر مائک رکھکر بیٹھ جاتے ہیں
عوام کے مطالبات ——— کنواری بیٹیاں
وہ تاکتے جھانکتے ادا سے مُسکراتے ہیں
لیکن ان بچوں کو ڈرنا یا جھجکنا نہیں چاہیے
اور نہ کوئی اُمید باندھنی چاہیے
کیونکہ یہ لفظ بھی ــــ اور اُن کو الاپتے ہونٹ بھی
سب ـ بالمثل ـ ہیں

نوخیز لڑکی

میں نے جب تیری سیج پر اپنا پاؤں دھرا
میں ایک نہیں تھی ——— دو تھی
ایک پوری کی پوری بیاہتا اور اِک پوری کنواری
سو تیری خوراک کی خاطر، ایک کا قتل روا تھا
میں نے قتل کیا تھا
ایسا قتل جو قانوناً جائز ہوتا ہے
صرف اُن کی رسوائی ناجائز ہوتی ہے
میں نے وہ زہرابِ ذلّت نوش کیا تھا
اور جب صُبح ہوئی تو میں نے
خون میں لتھڑے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تھا
دھوتے میں نے ہاتھ کچھ ایسے ———
جیسے باقی اَسودیں اعضاء دھونے تھے
لیکن جونہی میں نے آئینے میں دیکھا، وہ تو میرے آگے کھڑی تھی
وہی کہ جس کو اپنی طرف سے، رات کو
میں نے قتل کیا تھا
میرے خدایا! سیج کی ظُلمت کیا اتنی ہی گھور تھی؟
میں نے کِسے قتل کرنا تھا اور کِسے کر بیٹھی.

خالی جگہ

صرف دو دریا ستیں تھیں ــــــ
ایک نے مجھکو اور اس کو بے دخل کیا تھا
دوسری کو پھر ہم دونوں نے تیاگ دیا تھا
اس ننگے آکاش کے نیچے ــــــ
میں کتنی ہی دیر بدن کی بارش میں نم پوش رہی تھی
اور وہ کتنی دیر بدن کی بارش میں گلتا ہی رہا تھا
پھر برسوں کی محبّت کو ایک زہر کی صُورت پی کر
اُس کے کانپتے ہاتھ نے میری کلائی کو تھاما تھا
چل! لمحوں کی دیواروں پر اک چھت ڈالیں
سچ اور جھوٹ کے بیچ کہیں پر
تھوڑی سی جگہ خالی پڑی ہے

اِک ملاقات

میرا بدن اِک شجر پُرانا اور عشق تیرا ہے ناگ پھنی
جو مدّتوں سے میرے بدن کے تنے کی اِک کھوہ میں
اقامت گزیں رہا ہے
یہ اژدروں کا قیام سچ ہے ہر اِک شجر کا
وگرنہ یہ شاخسار اور برگ و بار سارے
ہیں ایک پھیلاؤ سا بدن کا
ہمیں یہ پھیلاؤ بھی ہے پیارا
کہ زرد دن جھڑ چکیں تو ——————
شاداب سبز دِن کا ظہُور ہو گا
اگر یہ ظُلمت درونِ سینہ بہت گھنی ہو
تو اُس پہ بھی بارہا دمکتے ہیں پھُول رنگیں
اور ایک شاخِ شجر کہ بچوّں نے
جس پہ ڈالا ہُوا ہے جُھولا ——
بڑی ہی رونق ہے اُس کے دم سے
نگاہ کر! اس زمیں کی برکت کو دیکھ بڑھ کر
میں پیڑ کی جون میں ہُوں پہلے سے بڑھ کے شاداں

مگر گھڑی بھر کے واسطے جیسے تیسے میں نے
شجر کی وسعت سے تھوڑی فرصت نکال لی ہے

چرا کے اک دُودھ کا پیالہ ——————
ترا بدن پوجنے کو آئی ——————
ترے مرے جسم کا یہ احساس ——————
قسم ہے اُس کھوہ کی جو پیڑوں کو لگ گئی ہے
تو سال بھر بعد ——————
مرے جیون میں ناگ پنچمی کا دن ہے آیا

ان داتا

اے ان داتا! میری زبان پر تیرا لہو ہے
تیرا نام میرے والد کے ہونٹوں پر تھا
اور میرے اس پیکر میں میرے باپ کا خوں ہے
کیسے بولوں! میرے کلام سے پہلے تیرا رزق صدا دینے لگتا ہے
کچھ نغمے تھے لیکن، ہم ہیں رزق کے کیڑے
رزق کے بوجھ تلے وہ نغمے دب کر دھول ہوئے ہیں
اے ان داتا! محنت کش ماں باپ نے نوکر بچے جن ڈالے ہیں
محنت کش کا منصب محنت ——————
باقی کام نبھاتے ہیں یہی جسم کے پتلے
وہ بھی کام ہے، یہ بھی کام ——————
ان داتا! میں جسم کی گڑیا ——————
مجھ سے کھیل اور مجھے کھلا لے ——————
جام لہو کا، پی لے، پلا لے ——————
تیرے آگے حاضر ہوں میں، استعمال کی شے ہوں اس سے
—————— جیسے چاہے کام چلا لے
ردّینہ ہوں، بیسی گتی ہوں، گوندھی گتی ہوں اور گیلی ہوں

گرم توے پر جس پہلو بھی چاہے تو پلٹا لے
میں لقمے سے بیش نہیں ہوں، جیسے چاہے نگل لے
تم لاوے سے بیش نہیں ہو، جتنا چاہو پگھل لو
لاوے کی پرتو میں لپیٹو، پاؤں پر میں کھڑی ہوتی ہوں
بانہوں میں مجھے بھر لو
چوموچاٹو، اور جو کچھ باقی بچ جائے اُسکے دام وصولو
اے ان داتا! میری زبان انکار کرے یہ کیسے ہو سکتا ہے
ہاں یہ محبت!
لیکن وہ تیرے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے

ایش ٹرے

الہاموں کے دھوئیں سے لے کر سگرٹ کی خاکستر تک
اُس کا سُورج ڈھلے جبیں پر سو برج جلے
ایک پھیپھڑا اگلتا جائے، اک ویتنام میں آگ لگے
ضوافشانی — جیوں ظُلمت کا جسم بُخار میں ہونکتا ہو
اور حرارت کے لرزے میں ————
ہر مذہب ہذیان بکے اور ہر حکمت لنگرائے
نظم نظم ہکلاہٹ طاری، لیکن کہنا چاہیئے
ہر دیش کی ملکیت ، بارود کی ملکیت ہے ————
اور ولادت کا ہر زائچہ ————
آدم کی پیدائش کی اک جھوٹی شہادت دیتا ہے
پاؤں میں فولاد لپیٹے ، کان میں سنگیں ریزے
بند ہو جائے سوچ کا کھاتہ ، کسی کا کام چلے
اور رہیں آدم — آخر بن جاتا ہُوں گوشت پوست کی ایش ٹرے
الہاموں کے دھوئیں سے لے کر سگرٹ کی خاکستر تک

ہم نے جو جو سوچیں پی ہیں، اُنکی راکھ بھی جھاڑی تھی
آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں
جی چاہے تو گوشت پوست کی ایش ٹرے کو۔
میز پہ آرائش کو رکھو۔
یا گاندھی، لوتھر، کینیڈی کہ کر توڑ بھی سکتے ہو

میں، عوام

ملکائیں ، شہزادیاں روز ہی دیکھتی ہُوں
ہاتھوں میں ہیں سہاگ کے کنگن ، پاؤں میں قانون کی جھانجھ
اُنکی ہتھیلی کی خاطر میں، روز ہی مہندی گھولوں، کبھی بھی کچھ نہ بھولوں
میں ہوں ہنرور جانتی ہوں، تقلید ہے عیب
سچ نہیں وہ ، لیکن وہی ہے اُس کا مالک
ظُلمت کے بستر پہ بسر ہو ، یا بستر کی ظُلمت پر ہو
بطن میرا بالک جنتا ہے ، وارث کو نہیں جنتا۔
بالک میرے سلیقہ والے ــــــــــــــ
وہ ہیں ہُنرور ، جانتے ہیں ، حق مانگنا عیب ہوا کرتا ہے
بچے میرے ، چپ چاپ جوانی سہہ لیتے ہیں
ملک کے اک انمول رتن کی خدمت میں لگ جاتے ہیں
میں ہُوں عوام ــــــ چُپ چاپ بُڑھاپا سہہ لیتی ہُوں
جُنبشِ چشم سمجھ جاتی ہُوں ــــــــــــ
سُلجھی ہوئی اِک داشتہ اپنے دیس کی ہُوں

ایک ملاقات

سالہا سال کے بعد اُن کا اچانک ملنا
جان دونوں کی کسی نظم کی صورت کا نپی
سامنے رات کھڑی تھی ساری
نظم آدھی کسی گوشے میں پڑی تھی تنہا
دوسری نصف کسی دوسرے گوشے میں کھڑی
اور جب صبح ہوئی ——————————
اور ملے کاغذوں کے اُڑتے ہوتے پُرزوں کی طرح
میں نے ہاتھوں میں جو ہاتھ اُس کا لپک کر تھاما
اُس نے باہوں میں میری باہنہ جکڑلی یک دم
اور سنر کی طرح دونوں ہُوتے ہم خنداں
اور اک ٹھٹھری ہوئی میز پہ کاغذ کو رکھا
کھینچ دی ایک لکیر اور بھی اُن شعروں پر

کمینے! بے وفا! بدذات، ظالم!!
جو یاد آؤ تو ناری لفظ کتنے ———
میرے سینے سے شعلے چاٹتے ہیں ———
دہن سے آگ برساتے ہوتے باہر نکلتے ہیں
تو پھر میرے بدن کی جلد نم مٹّی سی ہوتی ہے
سبھی الفاظ میرے خشک ہونٹوں سے چھلکتے ہیں
نشیبِ خاک میں بیجوں کی صورت بوتے جاتے ہیں
میں چپ سی ہانپتی مٹّی کی صورت ڈھلنے لگتی ہوں
تو ظالم میرے اعضاء میں سے اُگتے ہیں
بہت ہنستے ہوئے بے شرم پھولوں کی طرح اور میں
سیّاہ میلوں کی ہم صورت ———
مہک اُٹھتی ہوں کتنی بار، ———

میں

ہم عصر میرے بہت ہیں — فقط ایک "میں" ہے
— جو ہم عصر میرا نہیں ہے

جنم میرا "میں" سے تہی ہے —
یہ نیکی کی تھالی میں رکھی گناہ کی نشانی —
یہ لمحہ لمحہ، جو قیدی ہوا لحم کا —
نوسٹ کی اس زباں پر، جہاں بھی کوئی حرف اُترتا ہے
خودکشی کر کے مرتا ہے —
اگر خودکشی سے وہ بچ جاتے — کاغذ پہ اُترے تو جب قتل ہو جائے

بندوق کی ایک گولی
ہنوئی میں اک بار مجھ پر وہ چلتی ہے —
براگ میں دوسری بار لگتی ہے —
اور اک دود سا تیرتا ہے ہوا میں —
تو میرا یہ "میں" ہفت ماہ طفل کی طرح مر جاتا ہے
کیا کسی دن —
یہی میرا "میں" میرا ہم عصر بن جائے گا؟

باتیں

آؤ ساجن بیٹھ کر باتیں کریں
تیرے دل کے بوستانوں میں کہیں
چائے کی سرسبز پتّی کی طرح
بات جو، جس رُت میں بھی جا کر اُگے
توڑ لانا اُس گھڑی اُس بات کو

ہم نے ہر اک نرم و نازک بات کو پنہاں رکھا
اور ہر پتّی کو رکھا خشک ہونے کے لیے
گُل کے آتش دان میں ہم نے کریدیں بھوبلیں
ایک دو پھونکوں میں جل اُٹھی وہ چوبِ گُل شدہ
لے کے انگڑائی پکارا عشق آتش دان سے
تن بدن کی دیگچی میں آبِ دل تھا جوش پر

آ سجن آ کھول یہ گٹھڑی ذرا
چائے کی سبز پتّی کی طرح
ٹوٹ کر باتیں سبھی ضائع ہوتیں
احتیاطاً خشک کرکے ہم نے جو باتیں رکھی تھیں
ڈالنا اُن کو ذرا اس تن بدن کے آب میں
رنگ بھی اس کا بدل کر دیکھنا
تم بھی پینا اُس میں سے اِک گرم گھونٹ
میں بھی لوں گی اُس میں سے اک گرم گھونٹ
گرمیاں ہم نے بِتائیں عمر کی
سردیاں لیکن بہت مُشکل پڑیں ——
آ سجن ، باتیں کریں ——

روزی

نیل گوں آسماں کا اک گوشہ

. . . .

رات کی مل کا سائرن بولے
چاند کی سیم رنگ چمنی سے
گاڑھا سیمیں دھواں نکلتا ہے
خواب جیسے ہوں بھٹیاں روشن
بھٹیوں میں وہ آگ جھونکتا ہے
عشق میرا ملازمت پیشہ

ساعتیں اس طرح ہوتیں باہم
جیسے کوئی ہتھیلیوں پہ دھرے
ایک انداز ناز سے روزی
جو کوئی خالی ہنڈیا بھر دے
رندھ اور گوندھ کر لگا بھی دے

اور ہنڈیا کو جا کے اوندھا دھرے
اور باقی جو آگ بج جاتے
اُس پہ وہ ہاتھ سینک لے اپنے
اِک گھڑی کے لیے وہ ستا لے
شکر پروردگار کرتے ہوتے

رات کی مل کا سائرن بولے
چاند کی سیم رنگ چمنی سے
صرف اس آس پر دُھواں نکلے
جو کمانا اُسی کو کھا لینا
نہ کوئی ریزہ دوش کا باقی
اور نہ فردا کے واسطے رکھنا

چُپ کی سازش

اونگھتی رات ———

کسی نے انسانی سینے میں نقب لگاتی ہے

ہر سرنقے سے بھیانک ہے خوابوں کی چوری

چوروں کے پاؤں کے نشان ———

ہر اک ملک کے ہر اک شہر کی ہر اک سڑک پہ ثبت ہوتے ہیں

لیکن کوئی آنکھ نہ دیکھے اور نہ چونکے

صرف اک کتے کے مانند کسی زنجیر سے بندھی ہوئی

اک نظم کسی کی

کسی سمے پہ بھونک اٹھتی ہے ———

اک حادثہ

موت میری اک بات پرانی ..... کتنی بار اٹھوں اور سوچوں

چلو ..... ہار بنوا کر لاؤں ..... لاش کا قرض اتار آؤں میں

حادثے سب بتلا سکتی ہوں، ایک مگر کیسے میں بتاؤں

نعش ہوتی ہے نعش کی بھوکی، نعش کی کوکھ نہ بانجھ کبھی ہو

ہارے، کوکھ نعش کی ہارے، مردہ کوکھ کو ممتا مارے

نعش کا قرض چکا سکتی ہوں، کوکھ کا قرض چکاتے کون

کبھی کبھی میں ... جاگوں .. سوچوں، کوکھ کی لال بہی کو پھاڑ دوں

اپنے دستخط آپ چھپا لوں، اور اس قرض سے میں چھٹ جاؤں

اٹھنی ... پا چوکھٹ پر دھرتی، کوکھ کا سرقہ مارے مجھ کو

میری نعش کے سینے میں سے، بوند اک دودھ کی امڈ پڑے ہے

ملے ستون مقام سے اپنے، اس کی جگہ پر پاؤں کھڑے ہیں

اشک کا دریا تیر سکوں پر، دودھ کی بوند عبور نہ ہو گی

موت میری اک بات پرانی، ———

چیت

درِ پہ دستک چیت کی اِک نغمۂ امروز ہے
پیکرِ اُلفت پہ جیسے آ گیا عرقِ حروف
ہونٹ کِھلاتے ہیں بنتِ کلک کے
اور یوں اِک طربیہ امروز کا لکھا گیا
جیسے اُس کی انکھڑیوں میں
اُمڈ سے آنسو حرف ہا ———
وا ہوتے اوراقِ دل ———
اور اس طرح امروز کا اک طربیہ لکھا گیا
زخم ہاتے خامشی سے لفظ کے ٹانکے کُھلے
کتنا دیرینہ ہے سانسوں کا حساب
حادثے میں نے گزارے ہیں بہت
بڑھ رہے ہیں اب بھی اعدادِ شمار
کون اب میزانیہ اس کا بنائے
چیت لایا ہے بہی کھاتے سبھی
پھڑ پھڑاتی چشمِ نم اس خاک کی

موت کے سادہ ورق پر
زندگانی نے لگایا ہے انگوٹھے کا نشان
در پہ ماہِ چیت کی دستک ہوئی

مجبور

میری ماں کا بطن مجبور تھا
میں بھی تو اک انسان تھا، آزادیوں کے تصادم میں لگی ضرب کا نشان
اُس حادثے کا ٹیکہ، جسے میری ماں کی جبیں پر ضرور لگنا تھا
پھٹکار ہوں میں، جو انسان پر پڑ رہی ہے
پیدائش ہوں اُس وقت کی جب ٹوٹ رہے تھے تارے
جب بُجھ گیا تھا سُورج اور چاند بھی بے نُور تھا
میری ماں کا بطن مجبور تھا
میں کھنڈ ہوں اک زخم کا، میں داغ ماں کے جسم پر
میں ظُلم کا وہ بوجھ ہوں، جو ماں میری ڈھوتی رہی
اور پیٹ سے اُس کو سڑاند آتی رہی ——
جان سکتا کون، یہ مشکل تھی کتنی ——
انتہائے ظلم کو اک پیٹ میں لے پالنا
دست و بازو جھلسنا اور ہڈیوں کو سینکنا
میں ثمر اُس وقت کا
جب آزادیوں کی بیریوں پر بور بھی آنے کو تھا
میری ماں کا بطن مجبور تھا

وہ میرے یار، میرے اجنبی

اک بار اچانک تم آتے ——————

تو وقت بہت حیران میرے کمرے میں کھڑا تکتا ہی رہا

شاموں کا مہر غروب پہ تھا، لیکن وہ ڈوب نہ پایا تھا

کچھ دیر غروب کی قسمت کا لکھا ہوا نامہ بھول گیا

پھر ازلوں کے معمول نے اک فریاد بھرا سرگم چھیڑا

پھر وقت نے اب تک بیت چکے اور ٹھہرے ہوتے

لمحوں کو نظر بھر کر دیکھا

اور گھبرا کر کھڑکی سے چھلانگ لگا بیٹھا

وہ حادثہ —— بیتے لمحوں اور ٹھہرے ہوئے ساکت لحظوں کا

اب تمہیں بھی کتنا عجیب سا واقعہ لگتا ہے

اور مجھے بھی کتنا غریب سا سانحہ لگتا ہے

اور وقت کو بھی شاید یہ غلطی گوارا نہیں

اب شام ہوتے ہر روز یہ سورج وقت پہ اپنے چھپ جاتا ہے

لیکن بیتے اور ساکت لمحوں کا اک سچ بھی ہے

اب میں اور تم ——————

یہ مان سکیں یا نہ مانیں، یہ دوسری بات

پر اُس دن ——————————

جب وقت نے کھڑکی وا کر کے، باہر کو چھلانگ لگائی تھی
اور اُس کے گھٹنوں سے لہو رِس آیا تھا
وہ خون میری کھڑکی کے تلے
ہے آج کے دن تک جما ہُوا

اک نظم سی

جلا وطن ہو گئی ہیں یادیں تیری، بہت دن کی بات ہے یہ
خبر نہیں کچھ، ابھی وہ زندہ ہے یا کہ مردہ
فقط یہ اک بار حادثہ رونما ہوا تھا، خیال کی شب عمیق تر تھی
اور اتنی چپ تھی کہ ایک پتے کی چاپ پر بھی سماعتِ وقت کانپ جاتی
اور پھر تین بار ایسا لگا کسی نے، کواڑ سینے کے کھٹکھٹاتے ہیں
کوئی دبے پاؤں چھت پہ آیا ہے ——————
ناخنوں سے کریدتا ہے وہ پچھلی دیوار ——————
اُٹھ کے تینوں دفعہ ٹٹولی ہے میں نے زنجیر ——————
اندھیرا جس طرح دردِ زہ میں تڑپ رہا ہو ——————
کبھی وہ کچھ بڑبڑا رہتا، کبھی وہ خاموش گنگ ہوتا
کہ جیسے اپنی صدا کو دانتوں میں پیستا ہو
تو پھر کوئی جیتی جاگتی ایک شے، کہ زندہ سی ایک آواز
کالے کوسوں سے آ رہی ہو ——————
میں پہریداروں کی آنکھ سے یہ بدن چراتی، تھکی تھکی سی
بس جانتی ہوں کہ قلب تیرا ہے شاد و آباد

مگر کوئی اُجڑی اور ویران سی
جگہ ہے میرے لیے بھی؟

بہت سی ویرانیاں ہیں پر تم، جلا وطن ہو
نہیں کوئی بھی جگہ نہیں ہے تمہاری خاطر
میں ٹھیک کہتی ہوں، کوئی بھی جا نہیں ہے بالکل تمہارے لائق
یہ میرے پیکر — یہ میرے حاکم کا — حکم ہے
تو پھر کہ جیسے تمام ظُلمت ہی کانپ جائے
وہ پیچھے لوٹی، تو کوچ سے پہلے پاس آئی
وجُود میرا بس ایک بار اُس نے چھُو کے دیکھا
بہت ہی دھیرے، کچھ اس طرح
جیسے کوئی اپنے وطن کی مٹی کو چُومتا ہو

تخلیقی عمل

کبھی نظم کاغذ کو دیکھے، تو کچھ اس طرح اپنا موڑتی ہے
کہ جیسے وہ کاغذ کوئی اجنبی مرد ہو
پر کبھی جیسے سہاگن کوئی "روزہ کروا" کا رکھ کر اُسی
رات کو، ایک رویا سا دیکھے ______
اچانک کوئی عضوِ مردانگی مس کرے ______
تھرتھرا جاتے اُس کا بدن خواب میں ______
اور کبھی عضو اپنے وہ سہلا کے جاگے ______
چھُو کے دیکھے وہ گدراتے اعضا، کبھی کھول دے اپنی چولی کے سارے بٹن
کاسۂ دست میں بھر کے ڈلے بدن پر چمک چاندنی
اپنا پیکر نچوڑے تو ہاتھ اُس کے سسکیں
بدن کا اندھیرا صفوں کی طرح سے بچھے
اور وہ اوندھی چھاتی پہ لیٹی ہوئی، تیلیاں اُس کی توڑے
اور انگ انگ اُس کا سلگنے لگے
اس کو ایسا لگے جیسے اُس کے بدن کا اندھیرا
حلقۂ بازوئے آہنی میں چٹخنے کی چاہت میں گم ہے
اچانک بڑھے ایک قرطاس آگے

کپکپاتے ہوتے اُس کے ہاتھوں کو چھولے
کہ اِک عضو سوزاں ہے اور اک پگھلتا ہُوا
اور وہ اجنبی باس کو سونگھتی ہے
تو ہاتھ اُسکا — پیکر میں اُتری لکیروں پہ نظریں جماتا ہے
ہاتھ کو اونگھ آتی ہے۔ اُس کا بدن تھک سا جاتا ہے
ماتھے پہ شبنم سی آتی ہے ——————
طوالت پہ مائل وہ خط ٹوٹتا ہے — اور اک سانس
جنم اور اجل کے مرکب سے احساس میں بھیگ جاتا ہے
یہ پتلی سی کالی لکیریں ——————
کہ جیسے وہ لمبی سی اک چیخ کے بکھرے بکھرے سے ٹکڑے
وہ چُپ اور نُچڑ۔ کرکھڑی، دکھتی، سوچتی
ظلم جیسے کوئی ہو گیا ہو ——————
عضو اُس کا کوئی مر گیا ہو ——————
کہ شاید جو کنواری ہو ——————
اُس کا حمل اسطرح کا ہی ہوتا ہے ——————

لینن کے نام

تم، میری تاریخ کے یہ کیسے حسین کردار ہو
جو میری دیوار کے کیلنڈر سے نکل کر، نت اُسکی تاریخ بدل دیتے ہو
اور مجھ سے اک نئی سحر کی صورت ملنے آ جاتے ہو
کیلنڈر سے باہر آ کر تم سڑکوں پہ نکل جاتے ہو
اور اِک دُھوپ نکل آتی ہے ——————
جہاں بھی کوئی نرم سا گوشہ ہے، وہ برگِ سبز کی صُورت ہنسنے لگتا ہے
جہاں بھی کوئی میل زدہ سا گوشہ ہے وہ نادم ہو کر رہ جاتا ہے
لیکن یہ جو تیرے لیے اِک فطری بات ہے، تاریخ کا ایک غیر فطری عمل ہے
تاریخ ایک سُکھ کا سانس لیتی ہے
جب عہدِ ماضی میں بیٹھ کر بے حد پریشان ہو جاتی ہے
تو حال سے معاملت کرتی ہے

سو اس تاریخ کی خاطر ہی ——————
میں نے کتنی بار تجھے کیلنڈر میں قید کیا ہے
اور اس طرح اپنے عہدِ وطن کی مہر ثبت کر دی ہے
اور اس پر کتنے ہی اِزموں کی کیلیں ٹھونک دی ہیں

لیکن تم — میری دیوار کے کیلنڈر سے نکل کر، روز اُس کی تاریخ بدل دیتے ہو
اور نئی تشویش، نئی نجات ہاتھ میں لے کر ——
تم مجھے —— ایک نئے دن کی طرح ملتے ہو ——
تمہاری —— ایک نئے دن کی عظمت ——
جیسے میرے وجود کے اِک سایہ دار گوشے نے، تیری دھوپ کا ایک مصرعہ سُن لیا ہے
اور جو تاریخ کا غیر فطری عمل ہے ——
لیکن جو تیرے لیے فطری ہے، وہ میرے لیے غیر فطری بن گیا ہے

میں

آسماں جب بھی رات اور روشنی کا رشتہ مرتّب کرتے ہیں
ستارے مُبارک باد دیتے ہیں ـــــــــــــــ
میں کیوں سوچتی ہوں، جب کبھی' میں، جس سے تیرا کوئی رشتہ نہیں
جس رات کے ہونٹوں نے کبھی خوابوں کا ماتھا چُوما ہے
سوچوں کے پاؤں میں بجتی پائل سی اُس رات کو
ایک برق جب آسمان پر بادلوں کے صفحے پلٹتی ہے
تو میری داستان بھٹکتی، آغاز ڈھونڈتی ـــ انجام تلاش کرتی ہے
جب کبھی تیرے دل کا دریچہ بج اُٹھتا ہے
میں سوچتی ہُوں، میری جرأت سوال کی نوعیت کیا ہے
ہتھیلیوں پر حنائے عشق کا کوئی استحقاق نہیں
فراق کا ایک رنگ ہے، اور ایک خُوشبو ہے تیرے ذکر کی
تیرا حسن اجنبی راتوں کی ایک امانت ہے
یہ ایک منزلِ درد ہے جس کی منت مانگتی ہُوں
میں، جس سے تیرا کوئی رشتہ نہیں

○

سفر نامہ

گنگاہ کے پانی سے لے کر وادکا تک میری تشنگی کا سفرنامہ ہے
سادہ پاکیزہ ولادت، سادہ ناپاک سے عملوں کا، ایک سادہ علاج
اور کسی محبوب چہرے کو ایک چھلکتے جام میں پانے کا جتن
اور اپنے بدن سے ایک سچے اجنبی زخم کو بھولنے کی ضرورت
یہ کتنے مثلث پتھر ہیں ——————
جو پانی کے گھونٹ کے صدقے میں، میں نے حلق سے اُتارے ہیں
کتنے مستقبل ہیں —— جو حال سے محفوظ کرتے ہیں
اور شاید حال بھی —— میں نے حال سے محفوظ رکھا ہے

صرف ایک خیال سا آیا ہے،
کئی بار آتا ہے ——
جیسے کئی بار ایک سارنگی کا گز
ناگہاں کسی راگ کی چھاتی میں اُترے
یا ایک خاموش پیانو ——
سیاہ اور سفید دانتوں تلے سنگیت چباتے
ایک خیال آتا ہے ——————
لیکن جیسے، موت کا کوئی ایک گھونٹ چکھے

اُسکے تصوّر کی قے کردے
اور پھر عجلت میں،
چکھّے

لیکن مُردہ سینوں میں بھی کچھ سانسیں زندہ ہوتی ہیں
اور اُنکی ہوتی سانسوں سے آج میں کہ سکتی ہُوں۔
کہ ہر سفر صرف وہاں سے آغاز ہوتا ہے
جہاں، یہ سفر نامے ختم ہوتے ہیں

ثقافت

میں مہک ہُوں تیری سانسوں کی
یہ تیری ثقافت، تیرے اور اپنے مابین سجا کر
خورد الائچی، بیئر کا گھونٹ اور پان کا بیڑہ
مجھ سے کچھ پوشیدہ رکھتی، اپنے لہو کو چُراتی ہوتی
مہک ہوں تیری سانسوں کی، اور محض یہ مہک نہیں شاید
وہ سانس بھی ہے جو ہونٹوں سے ظاہر ہوتا ہے
وہ بات جسے الفاظ کی پوشش مل نہ سکے
وہ بات بھی میرے پلے ہے
الفاظ کہ جن کو ہونٹ نہ کوئی مل پاتیں —
وہ لفظ بھی میرے پلے ہے
تیری ثقافت، پوچھ سکو تو پوچھ ہی لو ——
یا راتوں رات ٹٹولو اُس کا کیسہ، کپڑا لتّا
میری غیر ممنوعہ بات کا حرف کہیں پر کھویا
یا تجھے خبر ہے تیرے سوا، اس قصر میں کون آیا ہے،
کوئی نہیں آتا تیرے سوا ——————

میں کوٹھڑی اندر کوٹھڑی —— روز اِک مہر جنم دیتی ہُوں
تیری ثقافت، بیرونی آکاش سے قرض میں روشنی لیتی
میرے سُورج کو تکتی ہے اور ہر روز جھٹک دیتی ہے
میں ہر روز اک سُورج جنتی ہوں ——
اور ہر روز یہ سُورج یتیم ہو جاتا ہے ——

اِک ملاقات

میں چُپ، پُرسکوں اور ساکت کھڑی تھی
صرف پہلو میں بہتے سمندر میں طُوفان تھا
پھر خُدا جانے کیا اس سُمندر کے سر میں سمایا
اُس نے طوُفان کو ایک گٹھڑی میں باندھا
اور مُجھے سونپ کر مُسکراتے ہوئے کچھ سرک کر پرے ہٹ گیا
میں تھی حیرت زدہ سی ——— مگر اُس کا اعجاز اپنا لیا
جانتی تھی کہ اس رنگ کے حادثے گاہے صدیوں میں ہوجاتے ہیں رونما
ان گنت خیال آتے ——— جبیں پر میری جھلملاتے
مگر میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی ———
کیسے اس کو اُٹھا کر میں اپنے نگر سے گزر پاؤں گی؟
اِس میرے شہر کی ہر گلی بند ہے
اس میرے شہر کی سقفیں نیچی بہت
ساری دیواریں چُغلی کے مانند ہیں ———
میں نے سوچا اگر تُجھ سے ہو سامنا
ہم سمندر کی صُورت تلاطم کو چھاتی پہ رکھے ہوئے
دو کناروں کے مانند ہنس پائیں گے
اور نیچی چھتوں، بند گلیوں کے اس شہر میں رہ سکیں گے

مگر دوپہر بھر، تجھے ڈھونڈتی رہ گئی
اپنی اس بات کو گھونٹ بھر کر پیا
میں اکیلا کنارہ، کنارے کو ڈھاتی رہی
اور دن ڈوبنے کی گھڑی
میں نے قلزم کو طوفان لوٹا دیا ——
رات اُترنے لگی ہے تو تم مل گئے
تم بھی چُپ، پُرسکوں اور اُداس
میں بھی چُپ، پُرسکوں اور ساکت
صرف دُوری پہ بہتے سمندر میں طوفان ہے

○

کئی برس کی بات ہے ۔ جب تم اور میں بچھڑے تھے
پچھتاوا تو کوئی نہیں تھا، صرف ۔ اک بات کہ میرے فہم سے بالاتر تھی
حرفِ وداع ہم کہنے لگے تھے ۔ پتے فروخت مکاں تھا ہمارا
مطبخ کے خالی برتن، آنگن میں ہر سو بکھرے تھے
شاید وہ میری یا تیری آنکھوں کے اندر جھانک رہے تھے
کچھ اوندھے تھے ۔ شاید اپنے مُنہ کو چھپانا چاہ رہے تھے
دروازے کی بیل تھی کچھ مرجھائی ہوئی سی ———
شاید تم سے اور مجھ سے کچھ کہتی ہوئی سی
جیسے پانی کی ٹونٹی کو کوئی الاہنا دینے لگی ہو
یہ سب کچھ اور اس جیسی ساری ہی باتیں، یاد نہیں آتی ہیں
صرف ایک بات، کہ بہت یاد آنے لگتی ہے ———
کہ ایک سڑک کا کُتا، کیسے اور کیسا سونگھ سونگھ کر اک
خالی کمرے میں گیا تھا ———
اور اُس کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہوگیا
اور پھر تیسرے دن جب یہ سودا تکمیل کو پہنچا
اور ہم نے نوٹوں کے بدلے گھر کی چابیاں سونپیں

گھر کے نئے مالک کو سارے تالے دیکر، ہر کمرہ دِکھلایا
تو اِک کمرے کے اندر کُتّے کی لاش مِلی تھی
میں نے اُسے بھونکتے ہوتے نہیں سُنا تھا
صرف اُس کی بُو سونگھی تھی

اور وہی بُو اب بھی اچانک ——————
مجھے کئی چیزوں سے آنے لگتی ہے ——————

ایک خط

بس کارنس پر پڑی ہوتی کتاب ہوں کوئی
شاید کسی واعظ کا وعظ ہوں، یا حمدوں نعتوں کی تسبیح
یا کام شاستر کا ایک سانحہ
یا کچھ آسن، اور پوشیدہ بیماریوں کے نسخے ہیں
لیکن لگتا ہے — میں ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوں
(کچھ ہوتا تو ضرور کوئی پڑھتا)
تو لگتا ہے — انقلابیوں کی بزم سجی تھی
اور اس محفل میں قرارداد جو طے پائی تھی
میں اُس کے مسودے کی اِک نقل ہُوں
اور پھر اُوپر سے پولیس نے چھاپہ مارا
تو جو کچھ بھی طے پایا تھا، کبھی نافذ نہ ہُوا
صرف کارروائی کے لیے سنبھال کر رکھا گیا ہے
اور اب کچھ چڑیاں آتی ہیں
چونچ میں تنکے لاتی ہیں ——————
اور میرے بدن پہ بیٹھ کے وہ ——————
اپنی آنے والی نسل کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں

(دوسری نسل کی فکر کتنی حسین ہوتی ہے)
لیکن چڑیوں کے پر بھی تو بامقصد ہوتے ہیں
لیکن کسی قرارداد کا کوئی پر نہیں ہوتا
(یا کسی قرارداد کی کوئی اگلی نسل نہیں ہوتی)
صرف کبھی میں سوچتی ہوں، سونگھ کے دیکھوں، میرا مستقبل کہاں ہے؟
اور اس فکر میں میری جلد پھٹنے لگتی ہے
لیکن جب میں کچھ بھی سونگھنا چاہتی ہوں، تو صرف بیٹوں کی باس آتی ہے

او، میری زمیں کے مستقبل ——————
میں ترے حال کی سمت ہوں ——————

زرہ بکتر

میں نے دوستی کا زرہ بکتر پہن لیا ہے
اب ننگے بدن سے کچھ نہیں چھوتا
نہ دشمن کا ہاتھ، نہ میرے دوست کی باہیں
میں نے دوستی کا زرہ بکتر پہن لیا ہے
میں خوش ہوں، صرف یہ کیوں تم پوچھتے ہو مجھ سے
کہ کچھ خوشیاں اتنی اداس کیوں ہوتی ہیں؟
ابھی کچھ اُڑتی چڑیاں، میری جبیں پر بیٹھ گئی تھیں
شاید زرہ بکتر کو — اک پیڑ کی ہریالی جان کر
لیکن لوہے کے پتوں پر چونچیں آزما کر — وہ ابھی چیخی چلائی تھیں
اور میرے ماتھے سے اُڑ گئی تھیں ——
پاگل چڑیاں۔ زرہ بکتر بھی بھلا چڑیوں سے ڈرتی ہے؟
لیکن شاید کوئی چونچ انہوں نے جلد پہ بھی ماری تھی
میری جبیں کی جلد کچھ درد سا دینے لگی ہے
وقت نے آج گلے سے — ہر کپڑا اُتار دیا ہے
صرف تین جوڑے ہی تھے۔ اِک ماضی کا، اِک حال اور اِک مستقبل کا

اور شاید تینوں ہی بہت میلے تھے
اور ننگا وقت دیوار کے پاس کھڑا، کچھ شرمندہ سا لگتا ہے
یا اُس کی ننگی پُشت پر یہ جو کچھ سسکتا ہے، لیکن میری آنکھوں کا عکس ہے؟
اور اُس نے اپنا نہیں، میرا برہنہ پن پہنا ہے؟
لیکن میں — میں تو اِس وقت برہنہ نہیں ہُوں
میں نے تو دوستی کا زرہ بکتر پہنا ہوا ہے

تمغے

بہادر لوگ میرے دیش کے
بہادر لوگ تیرے دیش کے
یہ مرنا مارنا جانیں
سروں کو وارنا جانیں
علیحدہ بات ہے کہ
سر کبھی اپنا نہیں ہوتا
یہ انساں نعش ہے لیکن
خدا کی نعش سا عنقا۔
تو جب بھی آدمی کے بیچ میں
یہ رب کا ٹکڑا ——
فوت ہوتا ہے ——
تو اس کی ناپسندیدہ مہک
اٹھتی نہیں ہرگز ——
نہیں دلبر کسی کا ——
اور نہ خطرہ قرب کا کوئی

نہ خطرہ درد کا کوئی
فقط جو خط بڑا ہے ——
ان کی وہ تضحیک کرتا ہے
ہٹا دے خط جو سب کو راس نہ آئیں
سو ساری جیت ہے خالی خلل سے
اور سارا جشن بھی خالی رکاوٹ سے
تبسّم وقت کے لب پر
اور اُن کے سینوں پر آویزاں کرتا
نامرد جُرأت کے کئی تمغے

امرتا پریتم